ڈاکٹر صابر کلوروی

تحقیق کی زبان اور اسلوب

ادب کی مختلف اصناف ہئیت، مواد اور اسلوب کے نقطہ نظر سے مخصوص پہچان رکھتی ہیں۔ تحقیق بھی اپنی ایک شناخت رکھتی ہے۔ ادبی تحقیق کا مواد ادب کی مختلف اصناف سے ماخوذ ہوتا ہے لیکن یہ اپنے اسلوب کے حوالے سے منطق اور فلسفہ کے اصولوں سے خوشہ چینی کرتی نظر آتی ہے۔ اس کی بنیاد تحلیل، تجزیہ اور استدلال پر ہے۔ ادب کی دیگر اصناف میں لفظ اور معنی کے درمیان ابلاغ کی کئی سطحیں موجود ہوتی ہیں لیکن تحقیق کا اسلوب سادہ اور سپاٹ ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا غیر شخصی پن ہے۔ غزل، افسانہ، ناول، یا مزاحیہ مضمون پڑھ کر ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کا مصنف کون ہے، لیکن تحقیق کا کوئی ٹکڑا یا نمونہ دیکھ کر ہم اس کے مصنف کا نام نہیں بتا سکتے۔ یہی غیر انفرادی اسلوب تحقیق کو تنقید سے جدا کرتا ہے۔ اعلیٰ درجے کی تحقیق کا خاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع سے متعلق تمام مواد تک رسائی حاصل کر کے اس سے جو نتائج حاصل کرتی ہے وہ حتمی ہوتے ہیں۔ ایک ہی موضوع پر کام کرنے والے دو محقق ہمیشہ ایک ہی نتیجے پر پہنچیں گے بشرطیکہ دونوں نے مواد اور نمونوں کے انتخاب میں محنت اور ذہانت کا ثبوت دیا ہو۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تحقیق ایک طرح کا سائنسی عمل ہے۔ جس میں دو اور دو چار کی طرح قطعیت ہوتی ہے۔

محققین کے ہاں ''کہاں جاتا ہے'' ''یہ بات مشہور ہے''، ''شاید اس کی وجہ یہ ہے''

''ہوسکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو'' وغیرہ، قسم کے جملے نامکمل یا ناقص تحقیق کی نشان دہی کرتے ہیں۔ تحقیق میں جو کچھ بھی کہا جاتا ہے پورے اعتماد اور یقین سے کہا جاتا ہے یہ اعتماد اور یقین مطالعے، غور وفکر، نیز مشاہدے اور تجزیے کی بدولت آتا ہے۔ اس کا امکان بہرحال موجود رہے گا کہ آپ نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ صحیح نہ ہوں لیکن انھیں اس طرح پیش کرنا چاہیئے کہ قاری کے لیے شک وشبہ کی کوئی گنجائش موجود نہ رہے۔

تحقیقی زبان کی دوسری اہم خصوصیت عالمانہ وقار اور تمکنت ہے۔ یہ خوبی سنجیدہ طرز بیان اور استدلال سے حاصل ہوتی ہے، جس میں لفظ کا انتخاب اہم رول ادا کرتا ہے۔ تحقیقی مقالے چونکہ علمی ہوتے ہیں لہٰذا ان کی زبان اور پیشکش کا انداز بھی علمی ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ یہ خشک ہو۔ رنگینی اگرچہ تحقیق کے لیے نقصان دہ ہے تاہم اگر تحریر میں تھوڑی سی شگفتگی در آئے تو اسے ''مقالہ بدر'' نہیں کرنا چاہیئے۔

تحقیق کی زبان کی تیسری اہم خصوصیت اس کا ایجاز واختصار ہے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مواد قاری تک پہنچانا۔ حشو وزوائد سے اجتناب کرنا، موقع محل کی نسبت سے صحیح الفاظ کا انتخاب ہی تحقیق کو جاندار بنا سکتا ہے، الفاظ ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ ان کے استعمال میں فضول خرچی نہیں کرنی چاہیئے۔ اردو ادب کے بہترین نثر نگاروں کا گہری نظر سے مطالعہ کیجیئے تو معلوم ہوگا کہ وہ کفایت لفظی کی رموز سے پوری طرح آشنا تھے۔ اس ضمن میں یوں تو متعدد نام لیے جاسکتے ہیں لیکن ان میں مشتاق احمد یوسفی، پطرس بخاری اور مولوی عبدالحق سرفہرست ہیں۔ ان کے ہاں بھرتی کے الفاظ شاذ ہی ملیں گے ان کی تحریریں حشو وزوائد سے پاک ہوتی ہیں کسی لفظ کا بے جا تکرار نہیں ہوتا، پورے پیراگراف میں کوئی لفظ نکال دیں، مطلب غارت ہو جائے گا۔ واضح ہو کہ ایجاز کا مقصد کم لکھنا نہیں بہتر لکھنا ہے، یوں اس کی بدولت عبارت میں حسن اور روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ کفایت لفظی اچھی چیز ہے لیکن اس حد تک بھی نہیں ہونی چاہیئے کہ تحریر معمّا بن کر رہ جائے چونکہ ایجاز کی سرحدیں ابہام سے ملتی ہیں لہٰذا عبارت آرائی میں زیادہ محتاط انداز بیان اپنانے کی ضرورت ہے۔ درج ذیل

اقتباسات کفایت لفظی کا عمدہ نمونہ ہیں۔

مولوی عبدالحق انتخاب کلام میر کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''کہتے ہیں کہ انسان کا طرز بیان اس کی سیرت کا پرتو ہوتا ہے یہ مقولہ شاعر کے کلام پر اور بھی زیادہ صادق آتا ہے۔ لیکن غالباً کسی شاعر کے کلام پر اس کی طبیعت اور سیرت کا اس قدر اثر نہ پڑا ہوگا جتنا میر کے کلام میں نظر آتا ہے جو شخص میر کے حالات اور ان کے اخلاق وسیرت سے واقف نہ ہو وہ ان کے کلام کو پڑھ کر بغیر کسی تذکرے کی مدد کے خود بخود ان کے انداز، ان کی طبیعت کی افتاد اور مزاج کو تاڑ جائے گا۔ اُن کے اشعار پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک ایک لفظ، طرز بیان، ترتیب و بندش میں ان کے قلبی واردات واحساسات کا نقشہ کھینچا ہوا ہے۔ وہ شعر میں اپنا دل نکال کے رکھ دیتے ہیں اور ان کی جدت بیان میں صاف ان کے تیور نظر آتے ہیں۔''(۱)

پطرس بخاری اور مشتاق احمد یوسفی کے درج ذیل نمونے اگرچہ تحقیقی نثر کے نمونے نہیں ہیں لیکن ان میں لفظوں کی نشست اور کفایت کا شعوری طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ اپنے مضمون ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی'' میں پطرس رقم طراز ہیں:

''وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے لفظوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اٹھتے ہی انھوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکابازی شروع کی کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالم خواب ہے ابھی سے کیا فکر، جاگیں گے تو لاحول پڑھیں گے لیکن یہ گولہ باری تیز، لحہ بہ لحہ تیز ہوتی گئی اور صاحب جب کمرے کے چوبی دروازے لرزنے لگے، صراحی پر رکھا ہوا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب

دروازہ ہے کہ برابر کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آباؤ اجداد کی روحیں اور میری قسمت خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہوگی۔۔۔خدایا کس آفت کا سامنا ہے۔ یہ سوئے کو جگا رہے ہیں یا مُردے کو جلا رہے ہیں اور حضرت عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی قم کہہ دیا کرتے ہوں گے زندہ ہوگیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مُردے کے پیچھے لٹھ لے کے تھوڑی پڑ جاتے تھے۔ تو پین داغا کرتے تھے۔''(۲)

مشتاق احمد یوسفی کا اسلوب تحریر ملاحظہ ہو:

''اوروں کا حال معلوم نہیں لیکن اپنا تو یہ نقشہ رہا کہ کھیلنے کھانے کے دن پانی پت کی لڑائیوں کے سن یاد کرنے اور جوانی دیوانی نپولین کی جنگوں کی تاریخیں رٹنے میں کٹی۔ اس کا قلق تمام عمر رہے گا کہ جو راتیں سکھوں کی لڑائیوں کے سن حفظ کرنے میں گزریں وہ فقط لطیفوں کی نذر ہو جاتیں تو زندگی سنور جاتی۔ محمود غزنوی لائق صد احترام سہی لیکن ایک زمانے میں ہمیں اس سے بھی یہ شکایت رہی کہ سترہ حملوں کے بجائے اگر وہ جی کڑا کر کے ایک ہی بھرپور حملہ کر دیتا تو آنے والی نسلوں کی بہت سے مشکلات حل ہو جاتیں''۔ (۳)

تحقیق میں کفایت لفظی کی یہ خصوصیت تحریر پر بار بار غور وفکر کرنے سے اور اصلاح سے پیدا ہوتی ہے۔ اردو کے مشہور مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے راقم الحروف کو ایک نجی ملاقات میں اپنی نثر کا راز بتاتے ہوئے بتایا کہ وہ ڈکشنری کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں، نیز کوئی چیز لکھنے کے بعد طویل عرصہ تک اُسے پڑے رہنے دیتے ہیں اور پھر کچھ عرصہ بعد اس پر جب نظر ثانی کرتے ہیں تو اس میں اعلیٰ درجے کی ادبیت پیدا ہو جاتی ہے۔

طول نویسی کو عام طور پر بُرا سمجھا جاتا ہے لیکن اس طرح کی تحریر پر جب نظر ثانی کی جاتی ہے تو اس کی تاثیر میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا محمد علی جوہر کا وہ فقرہ

آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے جب ان کے اخبار کامریڈ میں چھپے ہوئے اداریے کی تعریف کرتے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ کاش یہ مختصر ہوتا۔ اس پر محمد علی جوہر نے جواب دیا ''افسوس مختصر لکھنے کے لیے، میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

غالب اور اقبال کی شاعری کی عظمت کا راز ہی یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقات پر بار بار نظر ثانی کرتے ہیں ایک صاحب کو اقبال کا ایک فارسی شعر بہت پسند آیا جس پر اقبال نے بتایا کہ اس کی موجودہ صورت تک پہنچے میں انہیں ستائیس (۲۷) بار اصلاح کے عمل سے گذرنا پڑا۔ شعر یہ تھا:

درمیان کار زارِ کفر و دیں
ترکش ما را خدنگ آخریں (۴)

اسی طرح ٹالسٹائی کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے ناول ''وار اینڈ پیس'' کو سات مرتبہ لکھا۔

تحقیقی تحریروں میں کفایت لفظی کے علاوہ اس امر کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ اسلوب تحریر میں یکسانی اور توازن موجود ہو۔ جو اصول ابتدا میں وضع کیا جائے اس کی پیروی شروع سے لے کر آخر تک کی جائے۔ حوالوں کا انداز، سرخیوں اور عنوانات کی روش، نیز ذیلی عنوانات کی تقسیم کا عمل ایک طے شدہ اصول کے تحت ہونا چاہیئے۔ ابو الکلام لکھتے لکھتے محض آزاد لکھ دینا، کہیں دہلی لکھ رہے ہیں کہیں دلّی، کبھی علامہ اقبال لکھتے ہیں اور کبھی ڈاکٹر اقبال یہ سب یکسانیت کے اصول کے خلاف ہے۔ چونکہ مقالہ مختلف اوقات میں لکھا جاتا ہے اور دوران تحقیق انسان پر مختلف موڈ طاری رہتے ہیں لہٰذا بعض پہلوؤں سے یکسانیت پیدا کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ تاہم مقالے کے اختتام پر مسودے کو بار بار دیکھنے سے مطلوبہ نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ یکسانیت کے ساتھ ساتھ توازن بھی مقالے کی وقعت اور اہمیت میں اضافہ کرنے کا موجب بنے گا۔ توازن مقالے کے اجزا اور کل میں تناسب کا نام ہے۔ تحقیقی کام کرتے وقت اس امر پر بھرپور توجہ دینی چاہیئے کہ کون سی بات کو کتنے الفاظ میں بیان کرنا

ہے۔ جہاں اختصار ضروری ہے وہاں طوالت سے پرہیز کرنا چاہیئے اور جہاں تفصیل ضروری ہو وہاں اجمال سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

اندازِ تحریر موضوع کے اعتبار سے تبدیل ہوتا رہے گا۔ تحقیق کا اسلوب تکمیل، وحدت اور وضاحت کا طلب گار ہے لیکن اس کے ساتھ سنجیدگی، تاثر اور اختصار بھی اس کا وصف ہونا چاہیئے۔ طرزِ تحریر ایسی چیز ہے جس کا تعلق مطالعے اور تجربے سے ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں تو نگرانِ مقالہ بھی مقالہ نگار کی مدد نہیں کر سکتا۔ تحقیق کی وادی میں قدم رکھنے والے نو آموز محققین کے لیے ضروری ہے کہ وہ مستند محققین کی تحریروں کا بنظر غائر مطالعہ کریں اور ان کے اسلوب کی خصوصیات کو شعوری سطح پر گرفت میں لانے کی کوشش کریں۔

تحقیق میں الفاظ کے جچے تلے استعمال پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ الفاظ نگینے ہیں۔ ان کے استعمال میں جوہری کا سا ہنر درکار ہے۔ جو لفظ جس صورت حال کے لیے وضع ہوا ہے اُسے اس کی حدود ہی میں استعمال ہونا چاہیئے۔ یاد رہے کہ لفظوں میں بھی ایک طرح کی توانائی ہوتی ہے۔ اس توانائی کو ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ 'الفاظ کا برمحل استعمال' نیز ان کا انتخاب عبارت میں حسن پیدا کرے گا جس سے تاثیر میں اضافہ ہوگا۔ ادق الفاظ اور گراں قدر ترکیبیں قصیدہ گوئی کے لیے موزوں ہوں تو ہوں تحقیق کو اس سے دامن بچانا چاہیئے۔ لفظ کا صحیح استعمال معنی کی ترسیل اور تفہیم میں مددگار ثابت ہوگا۔ ایہام گوئی شعر کے لیے کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو تحقیق کے لیے بہت نقصان دہ ہے۔ چنانچہ الفاظ کو ان کے لغوی معنوں میں استعمال کیا جائے۔ شبلی نعمانی کا یہ قول ہمارے خیال کی مزید وضاحت کرتا ہے۔

> ''لفظ جسم ہے اور مضمون روح ہے دونوں کا ارتباط باہم ایسا ہے جیسا روح اور جسم کا ارتباط کہ وہ کمزور ہوگا تو یہ بھی کمزور ہوگی۔''(۵)

استعارہ، مجازِ مرسل اور کنائے کا تحقیق کی وادی میں کوئی گذر نہیں ہونا چاہیئے اسی طرح صنائع و بدائع سے بھی اجتناب ضروری ہے۔

یہ امر بحث طلب ہے کہ تحقیق کی زبان میں شگفتگی ہونی چاہیئے یا نہیں، عام طور پر

سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک خشک کام ہے، جس کی وجہ سے تحریر میں شگفتگی پیدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ تحقیق کی خشکی کو اسلوب کی شگفتگی سے کم کیا جا سکتا ہے۔ سادہ اسلوب، ندرت اور جدت ادا کی بدولت تحریر میں بانکپن پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن ہم ریسرچ سکالر سے اس کا مطالبہ نہیں کر سکتے کہ یہ چیز وہبی ہے اکتسابی نہیں۔

تحقیقی مقالے کو پر اثر اور خوشگوار بنانے والی چند اور چیزیں بھی ہیں جن کا خیال رکھا جائے تو تحریر موثر اور دلکش بنائی جا سکتی ہے۔ مثلاً مناسب طوالت کے اقتباسات، نیز سطروں کے درمیان یکساں فاصلہ اور مناسب حاشیہ اور سُرخیاں اس پر مستزاد زباندانی کی وہ صلاحیت ہے جو نہ صرف روزمرہ اور محاورے کے صحیح استعمال سے پیدا ہوتی ہے بلکہ اس میں قواعد اور لغت کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ صرف ونحو، علم قوافی، علم عروض اور تذکیر و تانیث نیز لسانیات سے واقفیت بھی، زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں چند مزید ہدایات فائدہ مند ہوں گی۔

☆ چنانچہ یہاں اس امر کی سفارش کی جاتی ہے کہ نامانوس الفاظ سے اجتناب برتا جائے۔ ایک مقالے سے دو فقرے بطور مثال:

(i) عالم رنگ و بو میں اچرج گل ہائے خوش نما اپنی دلفریبیوں سے ہر کہ ومہ کو مسحور رکھتے ہیں۔

(ii) مزاح کے بغیر فرد اور معاشرہ دونوں اکلاپے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ان فقروں کا مطلب اتنی آسانی سے کہاں سمجھ میں آئے گا۔

☆ کتابوں کے نام پوری صحت کے ساتھ لکھیے تا کہ کوئی مغالطہ پیدا نہ ہو۔

☆ جملے لمبے نہ ہوں اور ''میں'' کا استعمال کم سے کم ہو۔

☆ مخففات کا استعمال کم سے کم ہو۔ اگر ہو بھی تو اس امر کی وضاحت ابتدا میں کر دی جائے کہ آپ نے کس کے لیے کون سا مخفف استعمال کیا ہے۔؟

☆ جہاں کوئی انگریزی لفظ آئے تو وہاں قوسین یعنی بریکٹ میں انگریزی حروف میں

بھی نام لکھ دینا چاہیئے۔

☆ کسی لفظ کو اصطلاحی معنوں میں استعمال کیا جارہا ہو تو وہاں اس اصطلاح کی تشریح کر دینا ضروری ہے۔

☆ گنتی کے اعداد اگر سو تک ہوں تو ان کو حروف میں لکھا جائے۔ سو ۱۰۰ سے زیادہ ہوں تو اعداد کا استعمال کرنا چاہیئے۔

☆ مقالہ زمانہ ماضی یا ماضی قریب میں لکھنا چاہیئے لیکن نتائج کا ذکر زمانۂ حال میں کیا جاسکتا ہے۔

☆ اقتباس کو دو اوین میں رکھیں۔ اگر یہ تین سطروں تک ہو تو اسے عبارت کے اندر لکھیں ورنہ الگ پیراگراف میں دوسری تحریر سے ممتاز کر کے لکھیں.

☆ مخذوف جملوں کو تین نقطے لگا کر ظاہر کرنا چاہیئے اگر عبارت کا کوئی حصہ کسی مصنف سے رہ گیا ہے تو اسے بریکٹ میں لکھا جا سکتا ہے اگر عبارت میں کوئی غلطی ہو، تو قوسین میں لفظ 'کزا' لکھ دینا چاہیئے۔ پیراگراف کے آخر میں کچھ حصہ مخذوف ہو تو چار نقطوں سے ظاہر کیا جائے گا اگر پورا پیراگراف مخذوف ہے تو نقطوں کی پوری لائن دی جائے۔

☆ کسی تحریر کو عدد سے شروع نہ کیا جائے بلکہ عدد کو الفاظ میں لکھیں یا اس کا مقام بدل دیں۔

اب میں موضوع کے ایک نہایت اہم پہلو کی طرف آتا ہوں وہ یہ کہ تحقیقی مقالے کی زبان کن خامیوں سے پاک ہونی چاہیئے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ، چونکہ تحقیق کی بنیاد ہی عقل اور استدلال پر ہے لہٰذا مقالے میں خلاف عقل بیانات سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ مثلاً ناصر نذیر فراق خواجہ میر درد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایک دفعہ مریدوں کو اپنی کرامت دکھانے کے لئے خواجہ میر درد شیر بن گئے اور تھوڑی دیر میں پھر اپنی اصل حالت پر آ گئے۔''(۶)

اسی طرح جذباتی نوعیت کے بیانات سے بھی اپنا دامن بچانا چاہیئے۔ اس کی خوبصورت مثال سرسید احمد خان کی کتاب آثار الصنادید ہے جس میں دہلی کی عمارتوں کا حال بیان کرتے وقت سرسید پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے قارئین کو اُن آثار سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین کرنے لگتے ہیں۔ چونکہ یہ ایک تحقیقی کتاب تھی لہٰذا اگلے ایڈیشن میں سرسید نے اس طرح کے تمام جذباتی بیانات نکال دیے۔ اس ضمن میں صغیر بلگرامی کی ایک تحریر کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس میں وہ اردو کے آغاز کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''وہ دیکھو عرب سے عربی گھوڑے پر سوار عربی لوگ چلے آتے ہیں علی بن ابی طالب علیہ السلام کی خلافت کا زمانہ ہے بدن میں سفید سفید عبائیں سر پر اُجلے اجلے عمامے۔۔۔ دیکھیے دریا جنگل پہاڑ جو کچھ سامنے آتا ہے سب سے گزرتے چلے آتے ہیں پہنچے ہندوستان میں آدھمکے سندھ کو فتح کیا۔ دور، دور خدا پرستاں ہوگیا۔''(۷)

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ تحقیق کی زبان عالمانہ شان رکھتی ہے اور اس میں سنجیدگی اور وقار پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اسے شائستگی ہی راس آتی ہے۔ عناد یا تعصب کے تحت بعض لوگ پٹڑی سے اُتر جاتے ہیں اور واہی تباہی بکنے لگتے ہیں۔ عوام پر اس کا اثر ہو تو ہو لیکن خواص اس اسلوب بیان سے نفور ہو جاتے ہیں ایک مضمون سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''ان مذہبی پرستاروں اور سرپرستوں کا بنیادی جاہلانہ اور کورانہ عقیدہ یہی تھا کہ دین اور دنیا الگ الگ چیزیں ہیں۔ ان کوڑھ مغز جہلائے مذہب اور کورچشم مبلغین کے خلاف غم و غصہ کا شدید لاوا پکتا رہا ان نگاہوں کے سامنے دیوہیکل جسامین پُرغضب منحوس چہرے، چڑھی ہوئی تیوریاں، بل چڑھی ہوئی پیشانیاں، تنگ سینے، تاریک دل اور اوہام و خرافات سے لدے ہوئے دماغ آجاتے ہیں----''(۸)

اس اقتباس میں جس قسم کا لہجہ اختیار کیا گیا ہے وہ تحقیق کی زبان کے لیے ہرگز مناسب نہیں ہے۔ اسی طرح غیر ذمہ دارانہ باتوں سے بھی اجتناب کرنا چاہیئے اور ایسا دعویٰ نہیں کرنا چاہیئے جس کا ثبوت فراہم کرنا مشکل ہو جائے۔ مثلاً ایک نقاد نے کہا کہ غزل ایک درباری صنف ہے اس میں مقطع بادشاہ کے قائم مقام ہے اور باقی اشعار غزل گویا امرائے درباری ہیں جو کہ ہر قوت جوڑ توڑ میں لگے ہیں۔

سید محمد اپنی کتاب میں سائل دہلوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سائل بہت گم نام شاعر ہیں۔ ان کے نہ تو حالات ہی ملتے ہیں اور نہ کلام شائع ہوا ہے۔''(۹)

خلیل الرحمٰن داؤدی نے اس دعوے کی تردید کی ہے اور ایسے متعدد تذکروں کے نام گنوائے ہیں جن میں سائل دہلوی کا ذکر موجود ہے۔(۱۰)

حال ہی میں اردو نثر میں تحریف نگاری کے موضوع پر ایک مقالہ دیکھا جس میں محقق نے لکھا کہ اُسے تحریف نگاری کے فن پر کوئی ایسا مقالہ یا کتاب نہیں ملی جس میں اس فن کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہو۔

مقالہ نگار کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ ہندوستان میں پیروڈی کے موضوع پر مظہر احمد کی کتاب چھپ چکی ہے۔ چونکہ کوئی شخص اشاعت کتب سے متعلق معاملات پر حاوی نہیں ہوسکتا لہٰذا اس طرح کی باتیں پورے یقین کے ساتھ نہیں کرنی چاہئیں۔

اسی طرح صفات کے استعمال میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ''بے انتہا دلچسپ'' ''نہایت ہی عمدہ''، ''بالکل بے کار''، ''ناقابل یقین'' وغیرہ کی رائے زنی سے بچنا چاہیئے۔ اس ضمن میں میانہ روی ایک محتاط روش ہے۔ اسے اختیار کرنا چاہیئے۔ مبالغہ شاعری کی جان بن سکتا ہے لیکن تحقیقی نثر میں اس کی ذرا بھی گنجائش نہیں مبالغہ آمیز مدح سرائی یا دل آزارانہ تنقید دونوں سے پرہیز لازم ہے۔ شبلی کے ہاں مبالغہ آرائی کی متعدد مثالیں موجود ہیں مثلاً شعرالعجم جلد اول کا یہ بیان ملاحظہ ہو جس کا اسلوب مبالغہ آمیز ہے۔

''اسلام ایک ابر کرم تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپے پر برسا''

بعض حضرات تحقیقی مقالوں میں شاعرانہ رنگین بیانی کا جادو جگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے تحقیق کو نقصان پہنچتا ہے۔ سیدھی سادی عبارت میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنا چاہیئے۔ شاعرانہ رنگین بیانی کی عمدہ مثال شبلی کی سیرت النبیؐ کا درج ذیل اقتباس ہے۔

لکھتے ہیں:

''چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں۔ چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے سیارگاں فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنانِ قضا وقدر کی بزم آرائیاں عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، ابرو باد کی تز دستیاں؛ عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجز طرازئ موسیٰ، جاں نوازئ مسیح سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں شاہنشاہ کونین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دربار میں کام آئیں گے۔''

تحقیقی مقالے کی زبان کے حوالے سے آخری بات املا ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں املا کی اصلاح کے ضمن میں چند کوشیش کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں رشید حسن خان کی مساعی لائق تحسین ہیں۔ ابومحمد سحر، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی جیسے بزرگوں نے اس ضمن میں مفید تجاویز پیش کی ہیں۔ ان میں بہت سی باتیں، ایسی ہیں جن پر عمل کیا جاسکتا ہے راقم الحروف کے خیال میں اس ضمن میں سب سے اہم کام اُس کمیٹی کا ہے جسے املا کی اصلاح کی غرض سے حکومت ہندوستان نے قائم کیا تھا۔ یہ رپورٹ ''املا نامہ'' کے نام سے چھپ چکی

ہے۔ اسے گوپی چند نارنگ نے مرتب کیا ہے۔ رشید حسن خان کی نسبت اس کمیٹی کی سفارش خاصی سہل اور قابل عمل ہے۔ املا میں اصلاح کی غرض سے مقتدرہ قومی زبان نے بھی ایک سیمینار منعقد کیا تھا جس کی اکثر سفارشات قابل عمل ہیں لہٰذا تحقیقی مقالے میں ان اصلاحات کو رواج دینا چاہیئے۔

اپنے مقالے کا اختتام میں ڈاکٹر افتخار صدیقی کی کتاب ''عروج اقبال'' کے ایک اقتباس پر کرنا چاہتا ہوں جو راقم الحروف کے خیال میں مندرجہ بالا اصولوں کی روشنی میں ایک بہترین مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ اقبال کی شخصیت کے تشکیلی محرکات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ مبداء فیاض نے اقبال کو دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا لیکن ان کی شخصیت کا ناتراشیدہ ہیرا کسی ہنرمند صناع کی تراش خراش کا محتاج تھا۔ اقبال کو ہمیشہ اس امر کا احساس رہا کہ ان کے جوہر فطری کی نمود اور ان کے ذہن و ذوق کا نکھار شاہ جی کے فیض تربیت کا رہین منت ہے۔ چنانچہ وہ نجی صحبتوں میں اکثر بڑے ادب و احترام سے اپنے استادِ گرامی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں شمس العلما کے خطاب کے سلسلے میں شاہ جی کے نام کی تجویز پر جب گورنر پنجاب نے پوچھا کہ ان کی کون کون سی تصانیف ہیں تو اقبال نے جواب دیا تھا کہ ''میں ان کی زندہ تصنیف آپ کے سامنے موجود ہوں'' شاہ جی کی عظمت کا نقش، اقبال کے دل پر اتنا گہرا تھا کہ اس زمانے میں بھی جب اکابر قوم سے ''ترجمان حقیقت'' کا لقب وہ حاصل کر چکے تھے اپنے استاد کے سامنے احتراماً ان کی زبان نہیں کھلتی تھی چنانچہ ۱۹۱۳ء کی صحبت میں وہ فرمانے لگے کہ یورپ کے بڑے بڑے علما و حکما سے مختلف موضوعات پر بے تکلف باتیں کیں۔ لیکن نہ جانے کیا بات ہے

شاہ جی سے بات کرتے ہوئے میری قوت گویائی جواب دے دیتی ہے۔ اس بے پایاں عقیدت کا سبب یہی تھا کہ شاہ جی آل رسولؐ بھی تھے اور آئینہ دارِ جمال رسولؐ بھی۔ اقبال نے یقیناً اسی آئینے میں آفتاب رسالت کے جلال و جمال کا پرتو جلوہ فگن دیکھا۔ اقبال کہا کرتے تھے کہ ''اسوہ رسولؐ'' پر صحیح معنوں میں اگر کسی شخص کا عمل ہے تو وہ مولوی سید میر حسن سیالکوٹی ہیں۔ اسے شاہ جی کی صحبت ہی کا فیضان سمجھنا چاہیے کہ نوجوانی میں اقبال، حبِ اہل بیت اظہار کے جذبے سے سرشار تھے اور ان کے ابتدائی کلام میں اس کا اظہار بھی اس تکرار و تواتر سے ہوا ہے کہ لوگوں میں اُن کی تشیع کا چرچا پھیل گیا۔ اپنے اشعار میں شاہ جی کے ذکر کے ساتھ ہی اقبال اس برگزیدہ گھرانے کا ذکر ضرور کرتے ہیں جس کے وہ چشم و چراغ تھے گویا شاہ جی کی محبت اور اہل بیت کی محبت لازم و ملازم تھی''

حوالہ جات:

۱۔ مقدمات عبدالحق، ص۔۲۰۸
۲۔ پطرس کے مضامین از پطرس بخاری، ص۔۲۶
۳۔ چراغ تلے: مشتاق احمد یوسفی، ص۔۸۳
۴۔ احسان اقبال نمبر ۳۸، ص۔۱۲
۵۔ شعرالعجم: جلد چہارم، ص۔۱۹۲
۶۔ میخانہ درد، ص۔۱۴۱۔۱۴۲
۷۔ تذکرہ جلوۂ خضر، ص۔۲۱، ۲۲
۸۔ حکمت قرآن جلد ۶ شمارہ ۱۲۔ مضمون ڈاکٹر حافظ حامد
۹۔ ارباب نثر اردو، ص۔۱۸۴
۱۰۔ دیباچہ بہار دانش از مرزا جان طپش، طبع اول، مجلس ترقی ادب ۱۹۶۳، ص۔۳

اٹھارویں صدی اُردو شاعری کے لئے ایک بہت مبارک صدی تھی۔ اس صدی میں ایک سے ایک بڑھ کر نامور شاعر پیدا ہوئے۔ ان ہی شاعروں کے درمیان سید محمد میر سوز، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد اور میر تقی میر کے نام بہت ممتاز ہیں۔ یہ شاعر اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ چاروں صاحبِ دیوان شاعر اپنے زمانے میں شہرت اور ناموری کے اعلیٰ ترین درجوں پر فائز تھے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ مرزا محمد رفیع سودا خواہ میر درد اور میر تقی میر کو زمانے نے یاد رکھا لیکن سید محمد میر سوز کو فراموش کر دیا۔

یہ اَمر باعثِ مُسرت ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر سردار احمد خاں نے اس فراموش شدہ شاعر کو برصغیر پاک و ہند میں پہلی مرتبہ نہایت تحقیق کے ساتھ شائقینِ ادب کے سامنے اپنے صحیح خدوخال میں پیش کیا ہے۔ میر سوز پر اس سے پہلے اتنا جامع کام نہیں ہوا ہے۔

ہم موصُوف کے ممنون ہیں کہ آپ نے اپنی تصنیف کے اس حصے کی اشاعت کی اجازت ہمیں عنایت فرمائی۔

ادارہ